علیگ

● علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔ — ششماہی ایک روپیہ
● ہر مہینہ کی ۱۰ اور ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ — فی پرچہ ۲ر

جلد ۱	۱۰ر جنوری ۱۹۵۸ء	نمبر ۹

پچھلا سال ـــــــ کچھ علیگ کے بارے میں

اس پرچہ پر علیگ کا ایک دور ختم ہوگیا۔ عرفان حبیب، رشید شروانی اور رشید اکے Horizon، خلیل الرحمن اعظمی کے چوپال اور گزٹ اور احمد سعید کے مضراب کے بعد ستمبر میں ہم نے علیگ کے اجراء کا تجربہ کیا۔ اور ہمیں یہ اعتراف کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس کا خیر مقدم امید سے زیادہ حوصلہ افزا انداز میں کیا گیا، کچھ لوگوں نے منہ بنایا، کچھ نے دھمکیاں دیں لیکن Authorities اور طلبہ کے بڑے حلقہ نے ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ اس سلسلہ میں ہم پروفیسر حبیب، پروفیسر ہادی حسن، رشید صاحب، ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر آرزو، ڈاکٹر مقبول، ڈاکٹر نیب الرحمن، مونس صاحب، بشیر الدین صاحب (لائبریرین)، اور فضل صاحب (کیمسٹری) کے خصوصیت سے شکر گزار ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی ہمیں ان کا تعاون ملتا رہے گا۔

علیگ نے اپنے اس پہلے دور میں علی گڑھ کی صحافت میں کچھ نئے Patterns پیش کئے: بے لاگ صحتمند تعمیری تنقید، شخصیات کی چھان بین (جن میں پروفیسر، لکچرر اور کلرک کا امتیاز نہیں برتا گیا) ملک کے بعض اہم ترین مسائل کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ اور آزاد ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی اور مسلمانوں کی پوزیشن کا تعین اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی کی تحریک کا پرچار، یہ سب کچھ اگر ہم نہیں کرسکے تو کم از کم کرنے کی کوشش ضرور کی۔

شخصیات کے جو کارٹون ہم نے اب تک پیش کئے ان میں بعض باوجود کوشش کے اچھے نہ بن سکے بعض حضرات سے ہمارے کارٹونسٹ واقف نہ تھے اور کچھ طباعت کی کوتاہیوں کی نذر ہوگئے۔ اس سلسلہ میں ہم ڈاکٹر علیم اور مونس صاحب سے خصوصی طور پر معذرت خواہ ہیں۔

علیگ کا نیا دور کچھ نئے ولولوں اور امیدوں کے ساتھ شروع کیا جارہا ہے۔ اس میں آپ کچھ نئے فیچر بھی دیکھیں گے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا تعارف کرانے کیلئے ایک کالم مستقل طور پر وقف کر دیا گیا ہے۔ اُردو کے جدید شعراء کے انتخاب کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا جارہا ہے تاکہ نظم کے حصہ کی جو کمی محسوس ہوتی ہے اسکی تلافی ہوسکے جس میں پہلی بار ہم ساحر کو چھاپ رہے ہیں۔ علی گڑھ کی تاریخ کے سلسلہ میں ذاکر صاحب کی رپورٹس کی مدد سے کچھ مواد پیش کیا جارہا ہے جو پروفیسر ہارلیس کی تاریخ کا ضمیمہ ہوگا۔ اور شخصیات کے انتخاب میں بھی ہمارا رخ اب پروفیسروں سے ہٹ کر دوسری طرف ہورہا ہے۔ ہم حیثیت سے قطع نظر ہر قسم کی قابل قدر اور دلچسپ شخصیتوں کو علیگ کے صفحات پر جگہ دینے کی کوشش کرینگے۔

علیگ کو زیادہ سے زیادہ معلوماتی پرچہ بنانے کے پیش نظر کچھ اور مستقل کالم بڑھانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں مثلاً خبروں کے سلسلہ میں مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، امریکہ، اور روس پر ایک ایک کالم کا اضافہ، مذاہب عالم (اسلام، ہندوازم، بدھ ازم، عیسائیت وغیرہ) کا تعارف، اور دنیا کے ممالک کا تاریخی اور تہذیبی جائزہ، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم کچھ صفحات بڑھانے کے قابل ہوسکے اور علیگ مسلسل نکلتا رہا۔ اگر ہم اپنے ان مقاصد کی تکمیل نہ کرسکے تو کم از کم دوسروں کے لئے تو سوچنے کی ایک راہ ہے ہی!!!

علی گڑھ کا قاعدہ

پ - پ سے پراکٹر، ڈاکٹر ستیش چندر، شیخ صاحب کے وارث، Historical Research Institute کے ہیڈ، اور ڈاکٹر نورالحسن کے سب سے گہرے دوست۔ اچھے دوست اور اچھے انسان

پ - پ سے پیرجی۔ علی گڑھ میں پیرجی کو ان کے اصلی نام سے کوئی نہیں جانتا۔ نفاست اور شرافت کے اس پیکر کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ پرانا علی گڑھ اپنی تمام اچھی روایتوں کے ساتھ ابھی تک زندہ ہے۔ پیرجی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو علی گڑھ کو مرتے دم تک نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ علی گڑھ کی محبت ایمان کا جزو ہو کر رہ گئی تھی۔ جب کوئی سہارا نہیں رہا تو پیرجی نے پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن اب دنیا بدل چکی تھی، آخر وہ اپنی نسل کے لوگوں میں جا ملے۔ پیرجی کا آخری کارنامہ احمد سعید کا الیکشن تھا۔

ت - ت سے تاباں، جعفر مہدی صدر یونین (وی۔ایم۔ہال)، ایک غزل اور ترنم کے لئے یونیورسٹی میں مشہور

ت - تاریخ کا شعبہ: جس میں شیخ رشید، ڈاکٹر نورالحسن، ڈاکٹر ستیش، خلیق احمد نظامی اور ڈاکٹر محب الحسن جیسے اسکالر موجود ہیں۔ اس کے باوجود مطبوعات کا سلسلہ اتنا سست رفتار ہے اور ریسرچ ورک میں نسبتاً اسقدر کمی ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ شعبہ کو علی گڑھ سے باہر کام کرنے والے عہد وسطیٰ کے مورخوں کی مدد بھی حاصل کرنی چاہیے اور کم از کم ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا چاہیے۔ کسقدر افسوسناک ہے یہ امر کہ یونیورسٹی کے سب سے بڑے شعبوں میں شمار کیے جانے کے باوجود تاریخ کا شعبہ اب تک لاہور کے اورینٹل کالج میگزین کے پایہ کا رسالہ تک نہ نکال سکا۔ ایک رسالہ ہی ہے جو گرتا پڑتا کبھی نظر آجاتا ہے اور پھر کافی عرصہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ٹ - ٹریننگ کالج: کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

ث - ث سے ثاقب قدوائی: بے حد شریف اور سنجیدہ انسان انسٹرکٹر کیمسٹ

ج - ج سے جمال خواجہ: یونیورسٹی میں حسین ترین آدمی، شاعر مزاج، خلیق، یونیورسٹی کے ان چند گنے چنے لوگوں میں ہیں جو گفتگو کا آرٹ جانتے ہیں، کم عمر ترین اولڈ بوائز میں سے ایک۔ عبدالمجید خواجہ کے لڑکے ہیں اور آکسفورڈ کے آنرز

چ - چ سے چودھری محمد سلطان، شعبۂ سیاسیات کے ریڈر، آفتاب ہال کے پرووسٹ اور بہت اچھے Sports man ۔ بھاری بھرکم شخصیت، وجیہ صورت اور حسین سیرت کا مجموعہ۔ ان صفحات میں یونیورسٹی میں ان کا صرف ایک ہی شریک ہے، لیکن اس 'شریک' میں چودھری صاحب کی Sportsman ship اور ہر وقت چہرہ پر کھیلنے والی مسکراہٹ نہیں ملتی۔ چودھری صاحب مشرقی شرافت، نفاست اور سلیقہ کا اک نکھرا ہوا نمونہ ہیں ۔۔۔ علی گڑھ کا ایک جاندار [illegible]

(مسلسل)

ہماری یونیورسٹیاں ۔۔۔ ۱

دہلی یونیورسٹی

دہلی یونیورسٹی جو ہندوستان کی راجدھانی میں واقع ہے، چار مرکزی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے اور کسی نہ کسی حد تک فیڈرل یونیورسٹی کے تصور کو پورا کرتی ہے۔

دہلی یونیورسٹی ۱۹۲۲ء میں قائم ہوئی۔ لارڈ ریڈنگ اس کے پہلے چانسلر تھے۔ مختلف علاقوں میں گھومنے کے بعد اب یہ قدیم وائسرے گراؤنڈ پر واقع ہے اور تقریباً ۵۰۰ ایکڑ پر پھیلا ہے۔ سر موریس گوائر اسے فیڈرل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے، اور وہ اپنے عہد وائس چانسلری (۱۹۳۸ ۔۔ ۱۹۵۰) میں بہت حد تک اسے بروئے کار بھی لے آئے۔ اس وقت یونیورسٹی ۲۱ کالجوں پر مشتمل ہے جن میں سے ۱۲ یونیورسٹی علاقہ میں ہی واقع ہیں۔ یونیورسٹی ۸ فیکلٹیوں پر مشتمل ہے۔ آرٹس (۱۹۲۲)، سائنس (۱۹۲۳)، قانون (۱۹۲۴)، طب جدید (۱۹۴۵)، تعلیم (۱۹۴۷)، زراعت اور جنگلات (۱۹۴۷)، ٹیکنولوجی (۱۹۴۸)، سوشل سائنسز (۱۹۴۹)۔

اگست ۵۵ء میں طلباء کی مجموعی تعداد ۱۲۵۳۳ تھی، مرد ۹۱۵۷، خواتین ۳۳۷۶۔ ان میں ۲۰۰ سے زیادہ ریسرچ کے طلباء تھے، ۱۲۳۱ پوسٹ گریجویٹ اور ۹۰۵۹ انڈر گریجویٹ طلباء تھے، ۵۰۰ طلباء پری میڈیکل میں اور ۱۹۰۷ (Preparatory Class) ارتقائی جماعت میں تھے۔ ۲۱ کالجوں میں سے ایک یونیورسٹی سے منسلک ہے اور جس میں Pass Course پڑھایا جاتا ہے، باقی تمام میں Honours اور Professional کی تعلیم ہوتی ہے۔ حال ہی میں نئے مسائل کے پیش نظر یونیورسٹی کی پالیسی میں کچھ قابل ذکر تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ دہلی میں مہاجرین کی بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ یونیورسٹی علاقہ سے باہر بھی کچھ کالجوں کو کھلنے کی اجازت دی جائے، ایک اور تبدیلی یہ بھی کی گئی کہ سائنس کی تعلیم کی اجازت، جس کی مجاز اب تک صرف یونیورسٹی تھی، دوسرے کالجوں کو بھی دے دی گئی ہے اور اب دوسرے کالج بھی بی ایس سی (پاس) کے نصابات چلا رہے ہیں۔

یونیورسٹی کی مخصوص باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ڈگری کورس تین سال کا ہے۔ دہلی کے اسکول چونکہ ہائر سیکنڈری اسکیم کے مطابق چل رہے ہیں لہٰذا یہ بات بہت مناسب ہے۔ ثانوی تعلیم کے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں فیصلہ کیا ہے کہ ۱۹۶۰ء تک ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں دہلی کی اسکیم پر عمل کیا جانے لگے گا۔ ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یونیورسٹی وفاقی (federal) یونیورسٹی ہے۔ اور اس کے مشتمل کالجوں پر اس کا بڑا اثر اور عمل دخل ہے۔ دوسرے کالجوں میں ۷۰۰ سے زیادہ طلباء نہیں داخل کیے جا سکتے۔ کالج کے اساتذہ کا تقرر ایک تقرری کمیٹی کرتی ہے جس میں یونیورسٹی کی نمائندگی ضروری ہے، اور اساتذہ کے تمام مسائل یونیورسٹی میں پہنچتے ہیں۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کی تنخواہوں میں کوئی امتیاز نہیں۔ دہلی اسکول آف اکانومکس، اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز اور ڈپارٹمنٹ آف افریکن اسٹڈیز قابل ذکر ادارے ہیں۔ اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں ہماری یونیورسٹی کے ڈاکٹر عظیم اشرف دہلی کی فیکلٹی کے آنریری پروفیسر ہیں۔

مشتاق صاحب



بہت لانبا قد، ڈوبی ہوئی بھاری آواز،
گٹھا ہوا پہلوانوں جیسا جسم، ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ، جس پر جاڑوں میں کالی شیروانی کا اضافہ ہوجاتا ہے، ایک ہاتھ میں بیڑی، دوسرے میں قلم ــــــ اور کاغذ کے دھیان میں مست۔ بڑوں میں بڑا اور چھوٹوں میں چھوٹا، شعروادب کا رسیا جس نے زندگی کی تلخیوں کو شعروادب کی دنیا میں مست رہ کر بھلانے کی انتھک کوشش کی ہے، اس دیار میں جہاں لوگ خلوص کو ترستے ہیں اس کا خلوص ہر ایک کے لئے آمادہ، جہاں لوگ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ اپنے سینوں میں محفوظ رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں اس کا علم کسی بھی متوالے کی پیاس بجھانے کے لئے ہر وقت تیار، جہاں لوگ رفاقت اور دوستی کی بھیک مانگتے ہیں اس کی پرخلوص دوستی اور ساتھ ہر متلاشی کے لئے ہر گام موجود ــــــ جو یونیورسٹی کے بڑوں میں نہیں، اور پھر بھی بہت سے بڑوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے، یونیورسٹی کے "تشہیر یافتہ" ادیبوں سے کہیں بڑا ادیب، عربی اور فارسی کے جید عالموں کی ٹکر کا عالم ــــــ جس میں شاعر، نقاد، محقق، مورخ اور ایک اچھا دوست اور اچھا انسان سب ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں۔ پھر بھی اس کی شہرت اور عظمت کا تاج محل آج کہیں بھی نظر نہیں آتا، ہندوستان کیا علی گڑھ میں بھی نہیں ــــــ بس کچھ لوگوں کے دل ہیں جن میں انھوں نے اس کی عظمت کے تاج محل کو ایک تحفہ کی طرح محفوظ کر لیا ہے ــــــ اس کا تاج محل کبھی بھی تعمیر نہ ہو سکے گا اس لئے کہ وہ ایک معمولی کلرک ہے، اس لئے کہ اس کے پاس "تشہیر کا کوئی بھی سامان نہیں"، اسلئے کہ اس کے پاس کوئی رائج الوقت سکہ نہیں جسے گھسا کے وہ ریڈر یا پروفیسر ہوجاتا ــــــ یا شاید اس لئے کہ وہ اپنی عظمت کے راز سے خود بھی واقف نہیں، جو علی گڑھ کا سب سے بڑا پروپیگنڈسٹ ہوتے ہوئے بھی اپنا پروپیگنڈا کبھی نہیں کرتا، دوسروں کو ذرہ سے آفتاب بناتا رہتا ہے ــــــ لٹن لائبریری کا کیٹلاگر، آدھی درجن بچوں کا باپ، ۵ حالی روڈ پر رہنے والا یونیورسٹی کا ایک بہت ہی "معمولی آدمی" ــــــ یونیورسٹی کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ــــــ کاش آپ کبھی اس شخص سے ملے ہوتے۔

مشتاق صاحب ایک معمولی کلرک ہیں لیکن ان کی بات چیت، رہن سہن اور طور طریق سے اس معمولی پن کا کبھی کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ بڑے یار باش آدمی ہیں جنھیں تنہائی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں ایک انجمن پیدا کر لیتے ہیں۔ ویسے وہ خود اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں، جس جگہ جھوم کے بیٹھیں وہیں مے خانہ بنے۔ ان کی قدر کرنے والوں اور ان کے ملنے والوں میں کوئی تیسرے درجہ کا شخص نظر نہیں آتا۔ تیسرے درجہ کے آدمی کی ان کے یہاں سمائی بھی نہیں ہے، وہ خود قدرِ اوّل کے آدمی ہیں اور ایسی ہی ان کی انجمن۔ ان کے پرستاروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر آرزو، انجم اعظمی، نعمان صدیقی اور قیوم قائد ایک طرف ہیں تو قدردانوں میں خلیق احمد صدیقی، ڈاکٹر علیم، بشیر صاحب اور ذاکر صاحب دوسری طرف۔

مشتاق صاحب نے پتہ نہیں کبھی شاہد ہوش وخرد لٹانے کا موقع فراہم کیا یا نہیں، اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس ہر وقت خوش باش چہرہ کے پیچھے بہت سے چوٹ کھائے ہوئے نقوش چھپے ہوئے ہیں جو ابھی تک دھندلے نہیں ہو پائے، جن کے بل پر انھوں نے اپنی زندگی میں ایک نکھار پیدا کر لیا ہے جس میں رندی اور سرمستی کے توازنات کا دور دور پتہ نہیں اور پھر بھی رندی اور سرمستی سے سرشار ہے۔

مشتاق صاحب بہت اچھے شاعر ہیں بلکہ کہنا چاہئے شاعر تھے، اب تو وہ صرف فارسی اشعار کے مترجم ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن ترجمہ کو بھی وہ ترجمہ نہیں بننے دیتے اصل شعر سے کچھ اونچا ہی کر دیتے ہیں۔ بڑے اچھے ادیب ہیں اور اس سے زیادہ اچھے ادیب گر۔ تاریخ پر عالمانہ عبور رکھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ، دوسرے مورخوں کے لئے بڑے مددگار۔ بڑے اچھے انسان ہیں اور اس سے بھی زیادہ انسان گر۔ کاش ان کی صلاحیتوں سے صحیح معنی میں فائدہ اٹھایا جا سکتا۔

یہ پندرہ دن

ڈاکٹر علیم عالمی ادیبوں کی کانفرنس میں

دسمبر کے آخری ہفتہ میں دہلی میں Asian Writers کانفرنس ہوئی اس میں پہلی مرتبہ ایشیائی ادیبوں نے ایک جگہ بیٹھ کر ادب اور تہذیب کی مشترک اور جاندار قدروں پر تبادلۂ خیال کیا اور شعر و ادب کے مختلف مسائل پر ہر ملک کے ادیب نے اپنی اپنی رائے دی۔ کانفرنس میں علی گڑھ سے علیم صاحب اور سرور صاحب نے شرکت کی۔ سرور صاحب نے اُردو پر ایک مبسوط تقریر کی۔ اس کانفرنس کے تتمے کے طور پر ۲۹ دسمبر کو عالمی ادیبوں کی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں پنڈت نہرو اور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے افتتاحی تقریریں کیں۔ یہ کانفرنس اطالوی ناولسٹ مسٹر لیوی کی صدارت میں ہوئی۔ مباحثہ میں بہت کم لوگوں نے حصہ لیا۔ خاص کی چیز ڈاکٹر علیم کی تقریر تھی جس میں انھوں نے پنڈت جی کو صحیح معنوں میں Criticize کیا اور ادب اور تہذیب کے مسائل کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کیا۔ انھوں نے کہا "کسی کلچر کی نشو و نما میں ادیبوں کا رول کس حد تک موثر ہوگا یہ اس بات پر منحصر ہے کہ انھیں کتنی انفرادی آزادی ملتی ہے اور ادیبوں کی آزادی کا مسئلہ صرف غلام ملکوں میں ہی نہیں، یہ آزاد ملکوں کا بھی ایک مستقل مسئلہ ہے اور ان ملکوں کا بھی جنھوں نے سوشلزم کو اپنا لیا ہے۔"

کی ساری عمر علی گڑھ ہی میں گزری ہے۔ پہلے ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت سے اور پھر ایک قابلِ قدر استاد کی حیثیت سے۔ Geography اور Maths میں ایم اے ہیں اور لندن کے پی ایچ ڈی۔ کافی عرصہ تک شعبۂ جغرافیہ کے چیرمین رہے اور ۲۰ سال تک آفتاب ہال کے پرووسٹ رہے۔ ملٹری سائنس کے شعبہ کے چیرمین تھے اور N.C.C. کے کیپٹن۔ شاید اسی لئے ان کے اندر Military man کی بہت سی خصوصیات آگئیں، اچھا ڈسپلن، اچھا انتظام اور بڑے سے بڑے شخص کے سامنے بے لاگ انداز میں دو ٹوک بات کہنا، یہ سب شاید اسی تعلق کی دین ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ ہو پایا کہ ان کے کرخت اور پرخشونت چہرہ کے پیچھے اتنا درد مند پرسوز اور نرم دل انسان چھپا ہوا ہے۔ ہم سب ان کی جدائی سے پریشان ہیں، کاش وہ کسی طرح ہم میں پھر واپس آسکتے۔

یونین میں

● ــــ حافظ عبدالرؤف کی ادارت میں یونین کا ماہانہ رپورٹر Clarion طباعت کی آخری منازل طے کر رہا ہے۔ یونین کی تاریخ میں یہ پہلا سانحہ ہے جو قابلِ مبارکباد ہے۔

● ــــ ہاشمی اور آصف نے N.U.S. کے حیدرآبادی کنونشن میں

کچھ مصروفیتوں کی بنا پر مسٹر عرفان، دسمبر سے علیگ سے غیر متعلق ہو گئے ہیں اور آئندہ ہفتے سے مسٹر خان کا بھی علیگ سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔ آئندہ شمارہ سے علیگ کے مینجر کے فرائض مسٹر شبیر حسین ایم ممتاز ہاؤس انجام دیں گے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ میں

اس سال کانووکیشن ۲۰ جنوری کو ہو رہا ہے۔ ذاکر صاحب کانووکیشن ایڈریس دیں گے۔ یہ اس سال کے ڈگری پانے والوں کے لئے تو خوش نصیبی کی بات ہے ہی، دوسرے طلبا بھی ذاکر صاحب کو اپنے درمیان پھر دوبارہ پاکر کچھ کم خوش نہ ہوں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ یونیورسٹی گزٹ ۸ فروری کو "ذاکر نمبر" شائع کر رہا ہے۔ امید ہے گزٹ کا یہ نمبر ذاکر صاحب کے شایانِ شان حیثیت کا نکلے گا۔

ڈاکٹر مظفر علی گڑھ چھوڑ رہے ہیں

آفتاب ہال کے سابق پرووسٹ اور شعبۂ جغرافیہ کے محبوب ترین استاد ڈاکٹر مظفر شاید ہمیشہ کے لئے یونیورسٹی چھوڑ رہے ہیں۔ وہ ساگر یونیورسٹی میں شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر اور چیرمین ہو کر جا رہے ہیں۔ ان کے جانے سے شعبۂ جغرافیہ میں جو کمی آگئی ہے اس کی تلافی شاید کبھی بھی نہ ہو سکے گی۔ ڈاکٹر مظفر

علی گڑھ کی نمائندگی کی۔ امید ہے کہ وہ وہاں کے قابلِ ذکر مباحث، اپنے مشن اور کانفرنس کی غایت، اور بعد ازاں پر تبصرہ شائع کر کے یونین کے ممبران کو تفصیلی معلومات فراہم کر سکیں گے۔

علی گڑھ میں بیرونی مہمان

پچھلے پندرہ روزہ میں ہمارے معزز مہمانوں میں ازبک پروفیسر اور وسط ایشیا کے نامور ادیب ترسون زادہ قابلِ ذکر ہیں۔ ترسون زادہ کو یونین میں استقبالیہ دیا گیا اور شعبۂ اسلامیات کی طرف سے پرتکلف چائے دی گئی۔

کھیل کے میدان سے

انٹر ورسٹی نارتھ زون کرکٹ ٹورنامنٹ جو علی گڑھ میں ۱۵ دسمبر سے شروع ہوا ۱ جنوری کو ختم ہو گیا۔ علی گڑھ کے کپتان عبدالکبیر خاں عین وقت پر بیمار ہو گئے اور اس طرح ایک بڑی کمی آ جانے کی وجہ سے علی گڑھ کی ٹیم پہلے ہی میچ میں الہ آباد

شخصیت کی تعمیر

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

ہر انسان میں حیوان اور انسان دونوں ہوتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر کا حیوان دب جائے۔ اپنی بہیمیت کو دبانا اور اپنی انسانیت کو ترقی دینا ہی تعلیم کا سب سے بڑا راز ہے۔ جو لوگ اس درسگاہ میں اس غرض سے آتے ہیں کہ وہ یہاں امتحان پاس کرینگے، اور انھیں کوئی ڈگری مل جائیگی، ان کا ارادہ اور معیار پست ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کو روزی یا ملازمت مل جائیگی، یہ غلط تو نہیں ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔ تربیت ذہنی اور تربیت روح، یہ سب سے بڑا کام ہے۔ یہ عمر بھر کا کام ہے۔ یہ اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب سے ہم ہوش سنبھالتے ہیں۔ تعلیم گاہ کا مقصد یہ ہے کہ اس راہ میں آپ کے قدم صحیح پڑ جائیں۔ آپ یہاں اپنی تربیت کے لئے آئے ہیں۔

انسان اور جانور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جانوروں پر کسی قسم کی سماجی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشمکش میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے، پا بھی سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے اسکے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقے سے ملتی ہیں، ایک طرف الٰہی سے، اس کا واسطہ مادی اشیا کی دلفریب کشش سے بھی ہے اور مادیت سے دامن چھڑانے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خودغرضی و خودبینی کا مرکز بھی ہے اور محبت کی بے غرضی اور بے نفسی سے بھی اس کا سینہ معمور ہے، یہ سفاکانہ تخت و تاج کے بے خیال اور بر خود غلط جنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور یہ آئے گلشن کھلتی جاتی کا بھی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک ذرّہ بھی وقف کر سکتا ہے یہی حریصوں کی طرح پھوڑتا ہے، یہی بہادروں کی طرح لڑتا ہے، یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیرات کے شرمندۂ احسان ہیں۔ یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہی زمین سے نگاہ نہیں ہٹا سکتا، یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے، یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیات بے شرف تک پر راضی ہو جاتا ہے، یہی جان دیکر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے اور مرگ با شرف کو اصل حیات اور ضامن حیات مانتا ہے۔ یہی کشمکش کرتا ہے، یہی سر تسلیم خم کرتا ہے، یہی کافر ہے، یہی مومن، یہی فرعون ہے، یہی موسیٰ، یہی شرار بولہبی، یہی چراغ مصطفوی، یہی یزید، یہی شبیر ـــــ اور اسکے ارتقا کا سارا راز بہائم پر اس کی فضیلت ہے۔

اگر آپ اس غرض سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہ آپکو بعض واقعات یاد ہو جائیں تو یہ ٹھیک نہیں۔ جب تک علم حاصل کرنے والے پر کیفیت طاری نہ ہو جب تک وہ اسکی جستجو میں نہ گھلے جب تک وہ اسکے لئے تکلیفیں نہ جھیلے اس کا علم خام ہے۔ تاریخ کے تمام واقعات یاد کر کے ہم مورخ نہیں بن سکتے۔ اگر مورخ ہو بھی گئے تو انسان نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ تمام دنیا کے شعر یاد کر لیں تو آپ شاعری سے مستفید نہیں ہو سکتے جب تک آپ پر کیفیت طاری نہ ہو۔ انسان اپنی تربیت بہترین اقدار کو اپنا کر ہی کر سکتا ہے۔ ہمارے رسوم، زبان، ادب اور مذہب یہ سب امتحانی اقدار کی نشانیاں ہیں جو انکو اپنا لیتا ہے اپنے اندر رچا بسا لیتا ہے وہ کامیاب ہے۔ کبھی آپکا جی چاہتا ہے کہ ان مسائل کی کھوج میں پڑ جائیں جو ابھی حل نہ ہوئے ہوں، کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ شعر پڑھ کر خود بھی شعر کی تخلیق کے لئے دل بیدار ہو، کبھی سائنس کا تجربہ کرتے وقت آپکے دل میں یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ آپ بھی کسی حقیقت کو دریافت کریں؟

تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو روزی کمانے کے قابل بنا سکے۔ سوسائٹی میں روزی کمانے والا خودغرض نہیں۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس میں ہمیں باعزت زندگی گزارنا چاہئے، سوسائٹی کو آگے بڑھانا چاہئے۔ جو آدمی اپنی سوسائٹی کو جس حالت میں چھوڑ دیتا ہے وہ اس کا خائن ہے۔ ہر اچھا آدمی مرنے سے پہلے سوسائٹی کو اس سے بہتر حالت میں چھوڑتا ہے۔ جو لوگ تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں وہ بہت بڑا کام شروع کر چکے ہیں انھیں پہلا اپنے آپ کو سمجھنا ہے، اپنی صلاحیت کا جائزہ لینا ہے اور اپنی انفرادیت کا پتہ لگانا ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کے اندر کیا صلاحیت ہے، انھیں کیا کرنا ہے۔ انھیں اپنے لئے کونسی راہ منتخب کرنی ہے۔ اپنی صلاحیت اور اپنی انفرادیت کو پالینا اور اسکے مختلف عناصر میں یکجہتی پیدا کر لینا ہی کیریکٹر ہے۔ جب آدمی اپنے کیریکٹر کو کسی بڑے مقصد کیلئے وقف کر دے تو وہ شخصیت بن جاتی ہے اور اگر وہ شخصیت اعلیٰ اقدار کی سیوا میں لگ جاتی ہے تو اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے، اس کی زبان خدا کی زبان بن جاتی ہے کیونکہ خدا اعلیٰ اقدار ہی کا نام ہے۔ شخصیت دنیا میں خدا کا سب سے بڑا نائب بنتا ہے ہم ادنیٰ سے ادنیٰ اور کمزور سے کمزور لوگ بھی اعلیٰ اقدار کی سیوا کر کے بڑے بن سکتے ہیں۔

شخصیت کی تعمیر جماعت ہی میں رہ کر ہو سکتی ہے۔ مسلسل اور پیہم تنہائی میں شخصیت نہیں بن سکتی۔ انسانوں میں رہ کر انسانوں کا کام کر کے شخصیت بن سکتی ہے۔ آپ دوسروں سے بھلائی کریں گے تو جماعت بہتر بنے گی اور آپ کی شخصیت بھی بنے گی۔ سماج کی بھلائی میں اپنی بھلائی ڈھونڈئیے، چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں سے پوری جماعت کا وقار خراب ہوتا ہے۔ جماعت کی عزت اور ذلت ہم خود ہیں۔ محض چند لوگوں کی بداخلاقیوں سے پوری جماعت بدنام ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چند لوگوں کی وجہ سے سب لوگ بُرے نہیں ہو جاتے لیکن وہ چند بُرے لوگ بھی ہمیں میں سے ہیں، ہمارا ہی گوشت اور خون ہیں۔ انکی ذمہ داری بھی ہمیں پر ہے۔ اپنے ادارہ اور اپنی جماعت کو بہتر بنائیے، آپ کے ادارہ کی خوبیوں سے آپ میں خوبیاں پیدا ہونگی۔ آپ میں خوبیاں پیدا ہونگی تو آنیوالی نسلوں کو ایک بہتر سوسائٹی ملے گی۔

پڑھنا سب سے کم درجہ کا انسانی کام ہے، شرف انسانیت اصل مقصد ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنے دل میں لگن پیدا کیجئے۔ دنیا کا ہر ذرہ جواب دینے کیلئے تیار ہے بشرطیکہ کوئی سوال کرنے والا ہو۔ تمام دروازے کھلنے کے لئے بیتاب ہیں بشرطیکہ کوئی انھیں کھٹکھٹانے والا ہو۔



ساحر لدھیانوی

ساحر نئی نسل کے ممتاز ترین شاعروں میں سے ہے۔ ساحر کی شاعری سے اُردو کی ترقی پسند شاعری بلوغ کو پہنچی ہے۔ اسکے نغموں میں اس دور کی ساری محرومی، ساری اداسی اور سارا درد سمٹ کر آ گیا ہے اور اسی لئے اسکے گیت اور اس کے نغمے ساری نسل کے گیت بن گئے ہیں۔ اس نے انقلاب کے گیت گائے ہیں، رجز نہیں پڑھا، وہ روایت سے یکسر بے نیاز بھی نہیں ہوا ہے اور نہ اس نے اپنی تخلیقات کو پروپیگنڈہ بنایا ہے۔ آج جب ہم سب فیض اور مجاز میں گم ہو گئے ہیں ساحر اور جذبی وہ ایسے فنکار ہیں جنکی شاعری میں غنائیت، جذبہ کی سادگی اور خلوص نے انھیں نئی نسل کا امام بنا دیا ہے۔ ساحر نے نظمیں بھی کہی ہیں غزلیں بھی۔ ساحر کی نظمیں نیم رومانی اور نیم سماجی ہیں۔ شاعر اپنی محبت کے وسیلے سے سماج کے غموں تک پہنچتا ہے، 'کسی کو اداس دیکھ کر'، 'گریز' اور 'میرے گیت تمہارے ہیں' اسکے اسی ذہنی سفر کی ترجمانی کرتی ہیں ——— اسکی غزلوں کے ان اشعار کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو — برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے
میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو — دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے
ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار — ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں
اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں — تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی
موت آگئی نہ ہو مرے ذوقِ امید کو — محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن — خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

اور یہ ہیں اس دور کی شاہکار نظموں کے کچھ حصے :-

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے — سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کیلئے — سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے
کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں — نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں — ظلِ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر
کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش — سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ — توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

(نورجہاں کے مزار پر)

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے — کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں — کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار — مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور — جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں
میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہوگی — جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود — آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل — یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر — ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

(تاج محل)

یہ سب نظمیں [illegible] سے پہلے کی ساحر کی لکھی ہوئی ہیں جب سارا ماحول اسکے لئے تلخیاں ہی فراہم کرتا تھا لیکن باوجود دنیا میں بہت سی تبدیلیاں آ جانے کے، ساحر کا ماحول اب تک اس کے لئے تلخ ہے۔ اسکی 'پرچھائیاں' ——— ساحر کی طویل ترین نظم 'تلخیاں' کی نظموں سے بہت زیادہ الگ نہیں۔ تاہم THEME میں نیا پن آگیا ہے جسکی وجہ اس نظم کی تکنیک ہے۔ "یہ تکنیک ساحر نے براہ راست فلم سے لی ہے جس میں وہ گزشتہ ۸ سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا جس نے اب 'پرچھائیاں' نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔"

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے، وہی تاریکی — پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری — پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کے لئے چھوڑ چلے — ارضِ بنگال! انھیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول چنگاڑوں کی مظلوم خموشی کچھ بول — بول اے چپکے سسکتے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں — بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟ — ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

(پھر وہی کنجِ قفس)

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے :-

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل — مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسین پتیاں، حسین شاخیں — لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط — زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں — کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

[اور ان تصورات کی پرچھائیوں میں شاعر کو اپنی محبت کے مختلف مراحل کے ہلکے اور گہرے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں ——— اور پھر یکایک اس کے تصور میں جنگ کی ہیبت ناک پرچھائیں ابھرتی ہے، جس نے اس کی نوخیز محبت کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی زندہ دفن کر دیا۔ شاعر کی محبوبہ سرمایہ کے [illegible] کی نذر ہو گئی]

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر — کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب — کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں — بارود کی بوجھل بو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں

قہر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا　　ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
سڑک کے مصرف لوگوں کے کچھ خاکی وردی پوش آئے　　اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے لہراتے ہوئے مدہوش آئے
خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں　　مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں　　جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے　　چوپال کی رونق گھٹنے لگی بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے　　جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے
ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی برنائی بھی　　ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے بہنوں کے چہیتے بھائی بھی
بستی پہ اداسی چھانے لگی میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں　　آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دھول اڑنے لگی بازاروں میں بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں　　ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر روپوش ہوئی تہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی بڑھتے بڑھتے جنجال بنی　　مہنگائی بڑھ کر کال بنی ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں　　کتنی ہی کنواری ابلائیں ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے کھلیان بکے　　جینے کی تمنا کے ہاتھوں جینے ہی کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو جسموں کی تجارت ہونے لگی　　خلوت میں بھی جو ممنوع تھی وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

[تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں اور ایک شام شاعر کی محبوبہ جنگ کے پیدا کردہ افلاس اور معاشی بحران کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے]

اس شام مجھے معلوم ہوا کھیتوں کی طرح اس دنیا میں　　سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بیچی جاتی ہے
اس شام مجھے معلوم ہوا اس کارگہِ زرداری میں　　دو بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے

(اور پھر ـــــــ)

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دور کہیں تنہائی میں　　یا بزم طرب آرائی میں
میرے سپنے بنتی ہو گی بیٹھی آغوش پرائی میں ـــ اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں

مجبور ہوں میں مجبور ہو تم مجبور یہ دنیا ساری ہے　　تن کا دکھ من پر بھاری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے ـــ میں دار و رسن تک جا نہ سکا تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزل تسکیں پا نہ سکیں

جینے کو جئے جاتے ہیں مگر سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں　　خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

(نظم کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے جس میں شاعر محبت کے ان زخموں کا واسطہ دیتے ہوئے لوگوں کو جنگ سے نفرت کی طرف بلاتا ہے ....)

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا　　مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکش مرگ بے اماں ہی ملی　　انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

(... اور پھر ایک آواز ابھرتی ہے ... گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار ... نظم ختم ہو جاتی ہے ...)

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار　　عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار　　عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

کچھ ترکی کے بارے میں ـــــــ ایک خط

(عطیہ ابراہیم آصف)

.... انقرہ کے بارے میں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ یہاں کی ہر چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر شعبہ میں کافی ترقی کر لی گئی ہے۔ یہاں کا طرز معاشرت ہم لوگوں سے بہت جدا ہے، زندگی بہت ہی Artificial ہے، ہر جگہ تصنع اور بناوٹ نمایاں ہے۔ آراستہ مکانات میں رہنا، دولت کو نادر شاہانہ طریقے سے خرچ کرنا، اچھے کپڑے پہننا ـــــ یہی ان کا ماحصل زندگی ہے۔ مذہب سے بہت دور ہیں، مسجدیں اکثر خالی رہتی ہیں۔ کچھ رجحان پیدا ہوا ہے پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ صرف ہندوستان ہی میں مسلمان ہیں۔

یہاں پر عورت اور مرد کے مساوی حقوق ہیں، پہلے میں بھی مساوی حقوق کا قائل تھا مگر اب یہاں کی حالت دیکھ کر خیالات بدل گئے ہیں۔ یہاں پر زن و شو میں بنتی نہیں ہے۔ بہت جلد طلاق ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص خواہ مرد ہو یا عورت، پانچ پانچ اور چھ چھ بار شادیاں کرتے ہیں۔ اکثر مرد اور عورتیں کنوارے ہی رہتے ہیں، لڑکیاں اسی لئے باہری مردوں کو پسند کرتی ہیں۔

یہاں گرانی بہت زیادہ ہے، ہر چیز کے دام بہت زیادہ ہیں، خاصکر باہری اشیاء کے۔ اسلئے میں نے ٹائپ رائٹر خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ دوسرے یہاں انگریزی کا ٹائپ رائٹر مشکل ہی سے ملے گا۔ ترکی زبان کے ٹائپ رائٹر کے دام تقریباً ۲۰۰ لیرے ہیں یعنی تقریباً ۷۰۰ روپے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسی حالت میں، میں یہاں کیا خرید سکتا ہوں .... (اکمل ایوبی)

[انقرہ ـــــ ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۶ء]

پارے

• دوستی ان سے ہو گئی ہے عدم
جن کی ہر بات کاروباری ہے

• من از طریق نہ پرسم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و بعد طریق

• تم ہی کیا دیکھیں ابھی کتنوں سے ناتہ ٹوٹے
یہی دنیا ہے تو اب کون کرے پیار کی بات

• ہم تو برباد تھے برباد ہی ہونا تھا ہمیں
کیوں تری چشم عنایت پہ یہ الزام آیا

• اس پرسش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا سلسلہ :-

علی گڑھ ۱۹۰۳ء کے بعد

(ڈاکٹر ذاکر حسین)

اس ادارہ کی تاریخ ایک بڑی ذہنی تحریک کی تاریخ ہے۔ جمود ذہنی کو دور کر کے بیداری فکر کا ایک نیا دور شروع کرنے کی داستان ہے۔ نامساعد و ناموافق حالات میں خلوص نیت اور سعی پیہم کی کامیابی کی کہانی ہے۔ ایک صحیح بنیادی خیال کے ارتقائی سفر کی روداد ہے کہ اگر اسے سچے اور مستعد حامل مل جائیں تو وہ کیسے برابر آگے بڑھتا ہے۔ اور کیسے نئی نئی تشکیلات میں اپنے کو پورا کرتا ہے۔ کیسے اس کے اس سفر میں کبھی کبھی غلط اور غیر ضروری عواطف دامن گیر ہوتے ہیں اور اسے اپنے مطالبوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کسی طرح اپنا دامن بچا کر نہیں گزر سکتا تو رفتہ رفتہ کس طرح اسے چھڑا کر اپنی مقصد شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے۔

ایک ایسے زمانہ میں کہ روایت کی غلامی یا سطحی جمود کامل کا رنگ اختیار کر چکی تھی، پرانے نظام جماعتی کی بنیادیں دھنس رہی تھیں۔ تعصب اور ہٹ پر ایک نئی زندگی کی تعمیر ناممکن تھی۔ جدید علم کے خزانوں کے دروازے ایک دستک پر کھلنے کیلئے آمادہ تھے اور ذہنی کاہلی تھی کہ ادھر قدم نہ بڑھانے دیتی تھی۔ انتشار جماعتی میں انفرادی اغراض نے جماعتی مصالح پر غلبہ پا لیا تھا اور ساری بہتر صلاحیتیں اور ساری فضیلتیں خود غرضیوں کی خدمت گزار اور معاون بن جاتی تھیں۔ صالح فرد کے لئے صالح جماعتی زندگی کی ناگزیری کا احساس مفقود ہو گیا تھا۔ حوصلے پست تھے، ہمتیں شکستہ تھیں، توانائیاں معطل تھیں۔ ایک پر جوان ہمت سید احمد خاں نے احیاء ملت کا تہیہ کیا اور اپنی کوششوں کا مرکز ایک تعلیمی ادارہ کو بنایا۔ ایک بہت چھوٹے سے تعلیمی ادارہ کو۔ ہوتے ہوتے یہ پودا بڑھا۔ اسکی اقامت گاہوں کی سارے ملک میں آسانی سے نظیر نہ ملتی تھی۔ اسکے کھلاڑیوں نے نام پیدا کیا۔ اسکے طلبہ کے چال ڈھال، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی کی شہرت عام ہو گئی۔ علی گڑھ کا طالب علم اپنی سج دھج اپنے طور طریقے سے سارے ملک میں پہچان لیا جاتا تھا۔ اس تعلیم گاہ کے کام میں ملک کے سیاسی حالات نے، حکمراں قوم کی مخصوص مصلحتوں نے رخنے ڈالے، پیچیدگیاں پیدا کیں اور اسکی سیاسی ڈگر عام شاہراہ سے الگ ہو گئی۔ لیکن اسی ادارہ کے ممتاز طالب علم تھے جنہوں نے ۱۹۲۰ء کی سیاسی آزادی کی تحریک کو اپنی ان تھک اور بے لوث کوششوں سے وہ توانائی بخشی جو تحریک آزادی ہند میں آخری منازل تک کسی نہ کسی روپ میں کارفرما رہی۔ اس زمانہ میں کالج یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچا۔ اور اسی زمانہ میں اس سے الگ ہو کر اس کی اصل روح کو اپنے اندر لئے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا جس نے ملک کے تعلیمی فکر پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ یونیورسٹی ابتدائی اختیاری دشواریوں کے بعد برابر بڑھتی گئی نئے نئے شعبے کھلتے گئے، مصارف بڑھتے گئے۔ طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا حتی کہ ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے طلبا کی تعداد اور تعلیمی و تربیتی انتظامات میں ایک ناموافق نسبت پیدا ہو گئی تھی جسکا اثر کام کے معیار پر بہت مضر پڑا۔ یوں بھی سیاسی بحران کا زمانہ تھا اور یونیورسٹی کے لئے بڑا نازک زمانہ تھا تقسیم کے بعد اس کے جو نتائج رونما ہونے لگے وہ ایسے تھے کہ لوگ اس دار العلوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے۔ اسکے وجود کے قائم رہنے کو مشتبہ سمجھا جانے لگا تھا۔ طلبا کی تعداد یکایک کم ہو گئی تھی۔ بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے تھے۔ مالی امداد کے وسائل کم ہو گئے تھے۔ فیسوں کی آمدنی گھٹ گئی تھی۔ عطیوں سے آمدنی ختم ہو چلی تھی اور یونیورسٹی مجبور ہو گئی تھی کہ پچھلی خوشحالی کے زمانہ میں جو کچھ پس انداز جمع کیا تھا اسے کام میں لائے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ وقت بھی گزر گیا۔ وقت کی بڑی خوبیوں میں سے یہ بھی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ اور آج اگر ہم (پچھلے برسوں) پر نظر ڈالیں تو مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً فیکلٹی آف آرٹس میں ۱۹۴۸ـ۴۹ء میں کل ۵۰۰ طلبہ تھے۔ ایک سال بعد بھی تعداد ۵۰۰ سے آگے نہیں بڑھی، ۱۹۵۰ـ۵۱ء میں کل ۶۹۲ تھی مگر ۱۹۵۱ـ۵۲ء سے تعداد پھر بڑھنے لگی۔ پہلے ۱۱۵۰ ہوئی، دوسرے سال ۱۴۳۱ اور ۱۹۵۳ء میں ۱۵۱۲۔ فیکلٹی آف سائنس میں ۱۱۵۰ طلبہ بھی نہ تھے (۱۹۵۳ء میں یہ تعداد ۱۳۵۲ تک پہنچ گئی) انجینیرنگ کی فیکلٹی میں ۱۹۴۸ـ۴۹ء میں تعداد ۳۲۰ تھی (۱۹۵۳ء میں ۴۸۰ کی تعداد ہو گئی) Womans College میں تعداد گھٹ کر ۱۵۰ سے بھی کم رہ گئی تھی (۱۹۵۳ء میں ۲۲۲ طالبات تھیں) طبیہ کالج میں تعداد کل ۴۵ رہ گئی تھی۔ (۱۹۵۳ء میں یہ تعداد ۱۳۲ تک پہنچ گئی) تینوں اسکولوں میں مجموعی تعداد (۱۹۵۳ء میں) ۱۲۰۰ سے اوپر تھی۔ یونیورسٹی اور اسکولوں میں ملا کر ۱۹۵۳ء میں ۴۵۰۰ سے اوپر لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم تھے۔ ... سال میں تعداد ۸۰۰ گھٹی ہو گئی (اور اس سال طلبہ کی مجموعی تعداد ۵۰۰۰ سے اوپر ہے) (باقی)

سرسید اکیڈمی کی زیر طبع مطبوعات :-

- سرسید کا سفرنامۂ انگلستان
- اسباب بغاوت ہند (ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ)
- سرسید کی تفسیر ———— خلاصہ
- تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ (پروفیسر ارلیس اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریر)
- ذاکر صاحب کی تقاریر (علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے دئے ہوئے خطبات)
- عمر خیام (فارسی رباعیات کا مستند ترین مجموعہ اردو ترجمہ کے ساتھ)
- ماؤزے تنگ (حالات اور فلسفہ)
- ابن سینا (حالات اور فلسفہ)
- انتخابات کا سلسلہ (شاد عارفی، جذبی، جاوید کمال، اعجاز، اور خلیل الرحمن اعظمی کے کلام کے انتخابات